

فطرتِ انسانی قرآن اور حدیث

کھتے روشنی سے مٹی سے

غلام حسین اظہر، پیکچر گورنمنٹ کالج راولا کوٹ آزاد کشمیر

تاریخِ انسانی کے صدیوں پر محیط واقعات اور آئے دن رونما ہونے والے حوادث پر ہم جب نگاہ ڈالتے ہیں تو انسان کی شخصیت کے ایسے عجیب و غریب اور متضاد پہلو سامنے آتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ انسان کی فطرت کی ابتدا کیا ہے؟ آگ اور خون کے دریا سے گزر کر انسان کو بچاتے والا انسان دوسرے لمحے اپنے ساتھیوں کو موت کے گمٹ اتارنا نظر آتا ہے۔ چنگیز کی خون آشام تلوار ہزاروں انسانوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے تو سقراط ہنسی خوشی انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے زہر کا پیالہ نوش کر جاتا ہے۔ ان عجیب و غریب واقعات کو پڑھ کر انسان کے دل میں فطرتِ انسانی کو جاننے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ انسان کیا محض بد یا محض نیک ہے یا نیکی اور بدی کا مجموعہ۔ وہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہے یا اپنی تقدیر کا خود خالق ہے۔ ذہن میں ایسے سوالات بار بار ابھرتے ہیں۔ اور روزِ نازل سے اب تک انسان اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہے۔

فطرتِ انسان کے بارے میں ان اہم ترین سوالات کا جواب دریافت کرنے کی ہر دور میں کوشش کی گئی ہے۔ مختلف مفکرین نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور روحِ عصر کی روشنی میں مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ مفکرین کا وہ گروہ جس کی نگاہ تاریخِ انسانی کے بھیانک اور روح فرسا پہلوؤں تک محدود رہی ہے اُس نے انسان کو سراپا شر قرار دیا ہے۔ اور اس شر کی مختلف وجوہ اور اس کے مختلف حل تجویز کئے ہیں۔ بدھ مت کے نزدیک خواہشات کی نفی سے اس شر سے نجات ممکن ہے۔ ہندو مت کے نزدیک تناسخ کے ذریعے اس شر کے اثر سے چھٹکارا پایا جاسکتا ہے۔ دام مارگیوں کی دانست میں نیک اور بد کی تیز ختم کر دینی چاہیئے۔ چنانچہ وہ نجاست تک سے پرہیز نہیں کرتے۔ عیسائیت اس شر کی وجہ موروٹی گناہ کو قرار دیتی ہے۔ اور اس گناہ کا کفارہ حضرت مسیحؑ نے ادا کیا ہے۔ فلسفیوں اور ماہرینِ نفسیات کی بھاری اکثریت انسان کو مجبور و محض گردانتی ہے۔ ان کے نظریات کے مطابق انسان کی حیثیت سمندر میں ایک تکیے کی سی ہے جو بے مست پایا

دھارے کے رُخ پر بہتا چلا جاتا ہے۔ اور مندر کے تھپڑے اس کی منزل کو متعین کرتے ہیں۔ اس کے بس کی کوئی بات نہیں۔ بہت سی بحثوں کے بعد یہ حضرات انسان کو ماحولی کے سامنے سرنگوں کر دیتے ہیں۔ اور انسان کو طبعاً مجرم تصور کرنے کے بعد اس مزمن مرض کے علاج کے نسخے تجویز کرتے ہیں۔ اس بہت بڑے گروہ کے مقابلے میں ایک محدود گروہ ان مفکرین کا ہے جس نے انسان کی اچھائیوں پر توجہ دی ہے۔ لیکن یوں کہ اس کی کمزوریاں اس کی نظر سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ ان تمام مفکرین کے نظریات میں کسی نہ کسی حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن ایک رُخاططالعہ کی کوشش سازی نے انہیں متوازن رائے قائم کرنے نہیں دی۔ اسلام نے ان تمام نظریات کے برعکس انسان کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر انسانی فطرت کے بائیں میں معتدل اور متوازن نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ اُس نے انسان کو فرشتہ قرار دیا ہے نہ محض حیوان۔ بلکہ ان دونوں نظریات کے برعکس یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اور ان میں اسے امتیاز کرنے کی صلاحیت بھی بخشی گئی ہے۔ لیکن ان کو بڑے کار لانے میں انسان ہزار ہا وقتوں اور مجبوریوں کے باوجود آزاد ہے۔ اسلام انسان کو ایک زندہ قرار نہیں دیتا، جو نیکی اور بدی کے امتیاز سے بے بہرہ ہے اور اسے یونہی دنیا میں بغیر رہنمائی کے پھینک دیا گیا ہے۔ انسانی فطرت کے بارے میں قرآن مجید نے قطعی اور واضح الفاظ میں یہ رائے پیش کی ہے۔

۱۔ ولفس وما سواها فاللهما فخورها وتقواها فتدافع من زكها وقتد خاب من دسها۔

۲۔ الذی خلق فسوی والذی قدر فہدی۔

۳۔ بل الانسان علی نفسه بصيرة ولوالقی معاذیرہ۔

ان مذکورہ آیات میں قرآن نے بالوضاحت یہ بیان کیا ہے کہ انسان کے نفس میں نیکی اور بدی الہام کر دی گئی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اس میں صلاحیتوں کے ودیعت کرنے کے ساتھ نیکی اور بدی میں تمیز کی صلاحیت بھی بخشی ہے، اور انسان خواہ کتنے ہی بہانے تراشے، اس کا ضمیر اسے نیکی اور بدی سے ہمیشہ آگاہ کرتا رہتا ہے۔ اس نظریہ سے قرآن نے ان تمام نظریات کو باطل قرار دیا ہے جو ایسے نظریہ ارتقا کے قائل ہیں، جو انسان کو حالات کی گونگی اور بہری قوتوں کے سامنے بیچ قرار دیتا ہے جس کے نزدیک انسان روشنی کی تلاش میں اندھیرے میں ٹامک ٹوسیاں مار رہا ہے۔ روشنی کی تلاش میں کاروان زندگی اب تک

جھٹکا آ رہا ہے، اور کئی پرخطر گھاٹوں میں انسانیت بار بار لہو لہان ہوئی ہے۔ قرآن اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ روشنی کی شمع قلب انسان میں روزِ نازل سے روشن ہے۔

نظریہ ارتقاء کے غلط تصور کی تردید اور خیر و شر کے بائے میں متوازن نقطہ نظر پیش کرنے کے بعد قرآن نے جبر و قدر اور فرد اور سماج کے اس متنازعہ فیہ مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے جو خرد کی گتھیاں سلجھانے سے بہتر سمجھ لیا گیا ہے۔ قرآن کا نقطہ نظریہ ہے: انا هدینہ السبیل اما شاکراً او کفوراً۔ والذین جاهدو فمنا لنہدینہم سبیلنا۔ قرآن نے اس مذر رنگ کو ختم کر دیا ہے جس کی بنیاد پر اپنے گناہوں کا پھندہ معاشرے کے گلے میں لٹکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

قرآن نے انسانی فطرت کے بنیادی خدو خال کو بیان کرنے اور جبر و اختیار کی حدود کے تعین کے علاوہ اس اہم مسئلہ کو بھی سلجھایا ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی کی جو قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، ان کا مقصد کیا ہے۔ اور نیکی اور بدی کی یہ قوتیں انسان کو گرداب میں الجھانے کے بجائے اس کے لئے کیسے تیار کا کام دیتی ہیں۔ اس مسئلہ میں بیشتر مفکرین نے ٹھوک کھائی ہے۔ انہیں انسان نیکی اور بدی کی قوتوں کے ہاتھوں میں کھلونا نظر آیا ہے۔ اور انھوں نے اس آب و گل کے ہنگام کو ایک کھلڈٹے کا کھیل تصور کیا ہے، جو انسان کو مختلف مصائب میں الجھا کر تماشا دیکھ رہا ہے۔ یونانی المیہ کی بنیاد ہی اس تصور پر استوار ہے۔ قرآن کا نقطہ نظر اس نظریہ کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن کے نزدیک انسانی فطرت میں تمام ودیعت کردہ صلاحیتیں، جو سطحی نظر میں برسرِ پیکار نظر آتی ہیں، ایک دوسرے کی مدد و معاون اور لازم و ملزوم ہیں اور انسانی شخصیت کی تکمیل کے لئے ان کا وجود ناگزیر ہے۔ قرآن نے احسن تقویم، "تسویۃ اور عدل" کے جو الفاظ بار بار دہرائے ہیں، ان کا مقصد اس حقیقت کی نقاب کشائی ہے کہ انسانی فطرت میں ہی اس کی خرابی مضمّن نہیں بلکہ ان کا غلط استعمال تباہی و بربادی کا سبب بنتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار ہی ان آیات کریمہ کا اصل مدعا ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم ردناہ اسفل سافلیین۔

اسفل سافلیین کی منزل انسان کی اپنی کوتاہ اندیشیوں اور بد اعمالیوں کا نتیجہ ہے، ورنہ انسان میں ودیعت کردہ تمام جلیتیں انسان کے انفرادی وجود اور اس کے نوعی وجود کی بقا کے لئے اشد ضروری ہیں اور انسان کی بقا کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان میں سے ہر ایک خواہش اور اس کے حصول کی استعداد انسان کی سرشت میں رکھی گئی ہے۔ اصل مقصد ان صلاحیتوں کا متوازن استعمال ہے۔ اسلام ان صلاحیتوں

میں کسی صلاحیت کے دبانے یا مٹانے کا ہرگز قائل نہیں۔ اصل قابل اعتراض چیز ان کا بے محابا اظہار اور افراط و تفریط کی راہ ہے۔ انسان میں دو صلیحت کردہ جبلتیں انسان کی راہ میں رکاوٹ بننے کی بجائے اسے کیسے ترقی کی راہ پر لے جاتی ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ شاہ صاحب نے ہرگز زوری پر قائل ہونے والی صلاحیت کی نشان دہی بھی کی ہے۔ مثلاً ”وہ ملکہ جس سے حرص و آز کے دوائی کی مدافعت کی جاتی ہے، اسے قناعت“ کہا جاتا ہے۔ اور وہ ملکہ جس سے عجلت اور جلد بازی کے دوائی کی مدافعت کی جائے، اسے ”تانی“ کہا جاتا ہے۔ اور وہ ملکہ جس سے ”غیظ و غضب“ کی مدافعت کی جائے، اس کا نام حلم ہے۔“

شاہ ولی اللہ صاحب نے جن چند پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے، اس زاویہ نظر سے اور انسانی جبلتوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہر وہ جبلت جو بظاہر ہمیں ضرر رساں نظر آتی ہے، وہ دراصل بہت سے ایسے نقصان دہ امور کا تدارک کرتی ہے جو انسانیت کی بقا کے لیے زہرِ بِلابل ہیں۔

انسانی جبلتوں کی اہمیت اور افادیت اور ان کے بظاہر متناقض پہلوؤں میں ربط باہم کی نشاندہی کے علاوہ قرآن کے غائر مطالعہ سے ان قوتوں کا بھی ادراک ہوتا ہے جو بدی کی راہ میں روک تھام کرتی ہیں۔ قرآن کی نظروں سے چونکہ یہ پہلو اوجھل تھا اس لیے وہ CATHEXES اور ANTI CATHEXES

کا نام تو لیتا رہا لیکن وہ ان کے اس مدعا تک نہ پہنچ سکا۔ یہ CATHEXES اور ANTI CATHEXES کی کھینچا تانی درحقیقت نفسِ امارہ، نفسِ لواہ اور نفسِ مطمئنہ کی کش مکش ہے۔ انہی تین حالتوں کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں ”ہم“ (ID) ایگو اور ”سیر ایگو“ بھی کہہ سکتے ہیں۔ پہلے حیوانی حالت ہے، جو انسانی خواہشات اور نفسانی میلانات کا بے محابا اظہار چاہتی ہے۔ ایگو نفسِ لواہ کا کام دیتی ہے۔ ایگو، سیر ایگو اور اڈ کے درمیان سمجھوتے اور ان میں کئی یکسانیت سے نفسِ مطمئنہ کی کیفیات جنم لیتی ہیں۔ نیکی اور بدی میں امتیاز کی صلاحیت کے اظہار کی صورت کو قرآن نے نفسِ انسانی کی ان تین حالتوں سے واضح کیا ہے۔ نفسِ لواہ کے کام کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے ”حیا، منکر اور معروف“ کی اصطلاحیں بھی پیش کی ہیں۔ ان سے

اصطلاحوں کا بنیادی مقصد بھی اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان بعض اوقات حیوانی سرشتوں سے مغلوب ہو جاتا ہے لیکن یہ ”حق“ جسے مذکورہ بالا اصطلاحوں سے واضح کیا گیا ہے، انسان کو سرزنش کرتی ہے۔ یہ جس انسان کو گناہ سے روکتی بھی ہے۔ اور گناہ سرزد ہونے کے بعد اس کے دل میں چٹکیاں بھی لیتی رہتی ہے۔ اسلئے

تعلیم و تربیت کا اصل مقصود انسان میں چھپے ہوئے اس مادے کو فہم و شعور کی غذا مہیا کرنا ہے۔ اس صلاحیت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”جب تجھ میں حیا نہیں جو جی چاہے کرے اور اسی وجہ سے حضور ہر کام کے بارے میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ تو اپنے دل سے پوچھ، دل کی کسک اور کھٹک اسی جس کا منظر ہے۔ جوں جوں یہ کھکند ہوتی جاتی ہے، انسان گناہوں میں دلیر ہوتا جاتا ہے۔ حضور اکرمؐ نے چند احادیث میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

۱۔ ”نیکی طمانیتِ قلب ہے، اور شر و سوسہ اور دل کی کھٹک۔“

۲۔ ”نیکی حسنِ خلق ہے اور بدی وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے۔“

انسان میں نیکی اور بدی کے امتیاز کی یہ صلاحیت کیسے جنم لیتی ہے۔ اور کیسے آہستہ آہستہ بعض انسانوں اور معاشروں میں یہ صلاحیت مردہ ہو جاتی ہے اس پہلو پر قرآن و حدیث نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ قرآن حکیم میں ”نفسِ لوامہ“ اور حیا کی کھٹک کی واضح مثالیں سورہ یوسف اور سورہ مائدہ میں موجود ہیں۔ برادرانِ یوسف جب یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں پھینکتے ہیں تو نفسِ لوامہ کی کسک کو یوں دور کرتے ہیں کہ آئندہ وہ توبہ کر لیں گے۔ سورہ مائدہ میں قابل اور بائیل کے قصہ میں بھی اسی نفسیاتی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے۔ بہوڑ آدم میں بھی اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ نفسِ لوامہ کی کیفیات اور مجرموں کی نفسیات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سادہ اور دل نشین انداز میں یوں پیش کیا ہے کہ جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ ڈال دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بدی کی رغبت اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ توبہ کرتا ہے، یہ داغ مٹ جاتا ہے اور اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ بار بار گناہ کرتا ہے تو اس کا دل پوری طرح سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس کا نام رین ہے۔ رین کی کیفیت کو قرآن نے انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ”ان علیٰ قلوبہم ما کالو یکسبون۔“ رین۔ طبع۔ قفل کے متعلق مفسرین نے جو بحثیں کی ہیں، ان سے بھی فطرتِ انسانی کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ رین کی بحثوں کا لب لباب یہ ہے۔

رین۔ ”ایسا تغیر جو بیرونی اثرات سے پیدا ہو جاتا ہے۔ رین کے معنی رنگ کے ہیں۔ یہ لفظ اس دلالت کرتا ہے کہ کسی چیز کے اندر تغیر پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے اور وہ اپنی ماہیت کھو بیٹھی ہے۔ بے اظہار کے لئے رین کا لفظ بولا جاتا ہے۔“

”طبع“ اس نے دوسرے کے نقش کو قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔

”اقفال۔ اب یہ چیز خود نہیں کھل سکتی۔ خدا ہی اسے کھول سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ رین سے مُراد بیرونی گناہوں کا اس قدر اثر ہے کہ قلب جو سبکی کا منبع تھا، اس کی ماہیت ہی بدل گئی ہے اور اب وہ بدی میں دلیر ہو گیا ہے۔ لیکن طبع میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے دلوں پر گناہوں کا ٹھپہ لگ گیا ہے۔ اقبال ان کی اصلاح اپنے اختیار سے باہر ہو گئی ہے۔

اس موضوع پر قرآن و حدیث میں اور صوفیاء اور مفسرین کے ہاں جو مواد موجود ہے، اس کی روشنی میں فرد اور معاشرہ کے ربط باہم کا مسئلہ بھی سلجھ جاتا ہے۔ اسلام کے نظریہ کے مطابق انسان معاشرتی تقاضوں کے ہاتھوں مجبور محض نہیں ہے۔ لیکن وہ ان اثرات سے بھی دامن نہیں بچا سکتا۔ اسی وجہ سے قرآن و حدیث میں انفرادی اصلاح کے علاوہ اجتماعی اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ اور اسی لئے اقامتِ دین امتِ مسلمہ کا اولین فرض ہے۔ جب کسی معاشرے پر اس کے گناہوں کی وجہ سے عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی لپیٹ میں وہ صلحاء بھی آجاتے ہیں جو گوشہ گزین ہو کر اللہ کا نام لے رہے ہوتے ہیں۔ فرد اور سماج کے ربط باہم سے انسانی کردار کیسے متاثر ہوتا ہے، اس کو نبی اکرمؐ نے مختصر سے الفاظ میں واضح کر دیا ہے۔ ہر بچہ فطرتِ سلیم لے کر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے مجوسی، یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔ معاشرے کے ہمہ گیر اثرات کو واضح کرنے کے لئے ہی قرآن نے بدی کی راہ کو افضل سانلیں کہا ہے یعنی انسان لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے خود بخود معاشرے کا رنگ اپنا لیتا ہے۔ نیکی کی راہ کو سوز و بلد میں اتمامِ عقبۃ دُشوار گزار پہاڑی کو سر کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی دعوت کا آغاز ملوک اور ان کے حواریوں سے ہوتا ہے۔

قرآن و احادیث کی روشنی میں انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کے بعد چند اور سوالات بھی توضیح طلب ہیں۔ ان میں اولین سوال ان آیات کی توجیہ و توضیح ہے، جن میں فطرتِ انسانی کے چند تاریک پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً انسان چھپوڑا ہے۔ انسان ناشکرا ہے۔ انسان حریص ہے۔ انسان ظالم اور جاہل ہے۔ ان آیات کے سطحی مطالعہ سے اکثر حضرات کو یہ گمان گذرتا ہے کہ یہ آیات ان آیات کی تردید کرتی ہیں جن میں انسانی فطرت کے ارفع پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ ان آیات کے پس منظر اور اصل مدعا کو نظر میں رکھنے کی وجہ سے دلی زبان میں ان میں تناقض کا اعتراف بھی اٹھایا جاتا ہے۔ بظاہر یہ اعتراض بہت وزنی معلوم

ہوتا ہے لیکن یہ اعتراض وقتِ نظر سے کام لینے اور ان آیات کے اصل مدعا پر غور کرنے سے از خود دور ہو جاتا ہے۔ اولاً یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان آیات میں جن صفات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، وہ تمام انسانوں پر لاگو نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کا مقصد چند انسانوں کی گمراہیوں پر گرفت کرنا ہے۔ دوسرے یہ امر بھی غور طلب ہے کہ یہ سبھی صفات ہیں۔ ان کی موجودگی کے لئے ایجابی صفات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ہم ناشکر اُسے قرار دیتے ہیں جو شکر پر قادر ہو۔ اور جاہل اور ظالم اُسے کہیں گے جو علم اور عدل کی قدرت رکھنے کے باوجود اس سے کام نہ لے۔ اس سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ان آیات کا بنیادی مقصد ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانا ہے، جن سے انسان انحراف برت رہا ہے۔ ان پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کا مدعا یہ بھی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے کمزور پہلوؤں سے متنبہ رہے۔ اور اچھے پہلوؤں کا تحفظ کر سکے۔ یہ چیزیں نہ بطور چارج شیٹ پیش کی گئی ہیں۔ اور نہ جبریت کا تصور دینے کے لئے۔ بلکہ ان سے ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو ایک طرف ضروری بھی ہیں لیکن انہیں کا حد سے تجاوز ہونا خرابیاں بھی پیدا کرتا ہے۔

اس شبہ کے ازالہ کے بعد یہ اہم سوال بھی قابل غور ہے کہ انسان اگر طبعاً سلیم الفطرت ہے تو کیا وجہ ہے کہ طاعونی طاقتیں اکثر و بیشتر غالب رہی ہیں اور دنیا میں ہر دور میں جبر و تشدد اور ظلم و تعدی کا ہنگامہ پیا رہا ہے۔ ایسے سعید اُردار شاذ ہی آئے ہیں، جب انسانیت نے چین اور سکھ کا سانس لیا ہو۔ یہ سوال بہت اہم ہے۔ اور اس سوال پر غلط انداز سے سوچنے کی وجہ سے اکثر فلسفیوں اور ماہرینِ نفسیات نے انسان کو سراپا شر قرار دیا ہے۔ اور مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہو کر جبریت کے تصور کی حمایت کی ہے۔ تاریخِ انسانی کے دلدوز اور جانکاح واقعات پر نگاہ ڈالنے سے کئی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ دنیا ہنگامہ شر کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی صرف نظر ممکن نہیں کہ انسان نے کسی دور میں بھی باطل کو باطل جان کر قبول نہیں کیا۔ باطل کو ہمیشہ حق کے لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ باطل کے ان جھوٹے بادلوں سے چند دنوں کے لئے آنکھیں ضرور خیرہ ہوتی رہی ہیں لیکن بالآخر ہر دور میں ظلم سامری کو توڑنے کے لئے کوئی نہ کوئی موٹی بھی خیم لیتا رہا ہے۔ چراغِ مصطفوی سے شرابِ بولہبی کی پییم پیکار اس حقیقت کی غماز ہے کہ نیکی اور اچھائی کی طلب ہر دور میں موجود رہی ہے۔ لیکن چوں کہ عنانِ اقتدار خود غرض لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے اس لئے نیکی کی قوتیں مجتہ نہیں ہو سکیں۔ انسان نے عجلت میں بعض اوقات بدی کو نیکی سمجھ لیا ہے۔ لیکن اس کا مقصد بدی اور شر کبھی نہیں رہا۔ اس حقیقت کی طرف قرآن نے یوں توجہ دلائی ہے: ”ویدع الانسان بالشرد عاداً بالخیر وکان الانسان محبلاً اسی

کیفیت کو قرآن نے سہولت نفسیہ کے الفاظ میں بھی ظاہر کیا ہے۔ یعنی اس کے نفس نے اس بُرائی کو دلفریب بنا کر پیش کیا۔ غلط ماحول، غلط تربیت اور غلط معاشرے کی وجہ سے مختلف اُردوار میں ضمیر کی روشنی ماند ضرور پڑ جاتی رہی ہے لیکن کوئی دور بھی ایسا نہیں جب یہ روشنی بالکل بجھ گئی ہو۔ فطرتِ انسانی میں نیکی اور اچائی کی طلب کا داعیہ اور اس کے حصول کے لئے انسان کی ان گنت قربانیاں انسانیت کے روشن اور تابناک مستقبل کی ضمانت ہیں۔ فطرتِ انسانی کے اس داعیہ کو سامنے رکھ کر جب مختلف واقعات کا جائزہ لیا جائے تو مایوسی کی وہ تمام گھٹائیں چھٹ جاتی ہیں، جو وقتی طور پر تاریخِ انسانی اور فطرتِ انسانی کے یک رخا مطالعہ سے دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں اور انسان کو مایوسی اور قنوطیت کے قعر میں گرا دیتی ہیں۔

اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسان کو نہ تو اندھی اور بہری خارجی قوتوں کا تابع مہمل قرار دیا نہ جبلتوں کے ہاتھوں میں کھلونا۔ بلکہ ان قوتوں اور جبلتوں کا صحیح رخ متعین کرنے میں مدد دی ہے۔ اسلام نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ فطرتِ الہی کا منشا انسانی خواہشات پر پہرہ بٹھانا ہے نہ انسانی جبلتوں کو فنا کرنا۔ فطرتِ حق صرف یہ چاہتی ہے کہ انسان اپنی ان خواہشات کو پورا کرنے اور ان استعدادات سے کام لینے میں نرا حیوان نہ بن جائے۔ اسلام نے انسانی جبلتوں کی انادیت کو واضح کرنے کے علاوہ ان کے اظہار کی متوازن راہیں بھی متعین کیں۔ انوس یہ ہے کہ جدید علم نفسیات کا ارتقاء ایسے دور میں ہوا ہے، جب مغرب میں خود غرضی اور نفسانفی اپنے عروج پر تھی اور تنازعِ البقا کے نظریہ کے سہارے انسان انسان کا گلا کاٹ رہا تھا۔ ایسے حالات میں جنم لینے کی وجہ سے فریڈ جیسے نابغہ روزگار کی نظروں سے بھی وہ پہلو اوجھل رہے جو ایثار، بے نفسی اور بے لوثی کے منظر ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ حقیقت روشن ہوتی جا رہی ہے کہ انسان کے بارے میں یہ تصور غلط ہے اور یورپ میں فریڈ کی فکر کے خلاف بغاوت جاری ہے۔ اور یہ بغاوت خود اس حقیقت کی شاہد ہے کہ انسان ہزار بار جھٹکنے کے باوجود اچائی کا جو یا ضرور رہتا ہے۔ اور اس کی کوتاہیاں، جذبات کے سببانات میں آ جانے یا مبتلہ اور اٹل الہامی ہدایات کو نظر انداز کرنے کی صورت میں سرزد ہوتی ہیں۔ ورنہ انسان طبعاً سلیم الفطرت ہے اور نیکی اور بدی میں امتیاز کی صلاحیتوں سے پوری طرح بہرہ ور بھی۔

